عصر حاضر کی استعماریت اور عالمگیریت

روجر وَان زوانن برگ

جن میکانیات اور رویوں نے دور جدید میں استعماری نظام کی صورت گری کی ہے، وہ گلوبل نظام ہیں۔ علمی طور پر، دونوں وسیع اور پیچیدہ ہیں، ان کی باضابطہ وضاحت کی کوشش انہیں سادہ بنا کر ہی کی جا سکتی ہے، جس کے لیے مبالغے سے کام لینا مجبوری ہے۔

سب سے پہلے صورت حال کا ایک عمومی جائزہ لینا ضروری ہے۔ خود اپنی زمین کے ساحلوں سے دور قسمت آزمائی کرنے والوں کے لیے جو کچھ وہ دیکھ رہے ہیں، اسے سمجھنا اور یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ بحیثیت کل اپنے آپ کو کہاں پاتے ہیں، ایک سامراجی نظام میں بحیثیت کل۔ آج ہمارا استعماری نظام عالم گیر ہے اور دنیا کے ہر شخص پر اثر انداز ہوتا ہے۔

آئندہ صفحات میں کوشش کی جا رہی ہے کہ ہم اپنی دنیا کو ایک کل کے طور پر دیکھ سکیں، اور اس حوالے سے جو کچھ دیکھیں، اسے سمجھ بھی سکیں۔ مغرب کے سماجی علوم میں، کسی نظام کو بحیثیت کل دیکھنے کا معمول نہیں ہے۔ اور مذہبی بنیادوں پر قائم تعلیمی نظاموں میں اپنی دنیا کو اس طرح جانچنا کوئی آسان کام نہیں۔

کوئی شخص صحارا کے ریگستان میں رہتا ہو، افغانستان کے کسی دور دراز گوشے میں بستا ہو، ایشیا کے بارونق شہروں میں آباد ہو یا افریقہ کا باشندہ ہو وہ سرمایہ داری اور سامراجیت سے لازماً متاثر ہوگا۔ آپ منشیات کے دھندے کے لیے افیون کی کاشت کرتے ہوں، یا کاروں کی غیر قانونی تجارت آپ کا پیشہ ہو کہ دولت مندوں کو ٹیکس کی ادائیگی سے بچایا جا سکے، یا آپ کسی کثیر القومی کمپنی کی تیار کردہ بوتلوں کے ذریعے پینے کے پانی کا کاروبار کر رہے ہوں، آپ بچ نہیں سکتے۔ ہم کہیں بھی رہتے

ہوں، ہم ان طاقتوں سے محفوظ نہیں رہ سکتے جو اس دنیا کو چلا رہی ہیں۔

اسی طرح، ہمارے دور کی یہ بڑی طاقتیں اپنا کام کرتی رہتی ہیں، خواہ آپ انہیں دیکھ رہے ہوں یا نہ دیکھ رہے ہوں، حقیقت یہ ہے کہ ہر ملک کے حکمراں طبقے اور عالمی طاقتوں کے بڑے کاروباری ادارے، ہمارے ملک کو نئے نظام میں ڈھالنے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔

اس لیے یہ مضمون پوری انسانیت کے نام ہے، تاکہ ان دیوقامت طاقتوں کو سہل طریقے سے سمجھا جا سکے جو ہمارے عالمی نظام کی کرتا دھرتا ہیں۔

تعریفات

سامراجیت کی بالکل درست اور مکمل تعریف بہت ضروری ہے تاکہ اس موضوع کو صحیح طور پر سمجھا جا سکے۔ جس سامراجیت سے آج ہم سب کو سابقہ درپیش ہے، تاریخ کے تناظر میں ہم اسے بادشاہتوں کی دنیا کے جزو کے طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ یہ نئی شہنشاہیت، ماضی کی بادشاہتوں سے بالکل مختلف اور منفرد ہے۔

سامراجیت کا ایک کلیدی عنصر جسے جداگانہ طور پر شناخت کیا جانا چاہیے تاہم وہ اکثر ایک ہی چیز سمجھا جاتا ہے، نوآبادیت یا استعماریت ہے۔ استعماریت، ایک غالب و بالادست قوت کی جانب سے حملہ آور ہونے کا عمل ہے، جو یا تو مفتوح ملک پر اپنے مفاد میں خود حکومت کرتی ہے یا مقامی آبادی میں سے اپنے کارندوں کے ذریعے حکمرانی کرتی ہے اور اس میں بھی صرف اپنے مفادات کا حصول اس کے پیش نظر ہوتا ہے۔ پچھلی دو صدیوں کے دوران، سامراجی طاقتوں نے استعماریت کو اپنے مقاصد کے لیے مستحکم کیا، پہلی بار ۱۸۸۰ء کے عشرے میں، اور اب حالیہ تاریخ میں، یہ عمل عراق اور افغانستان پر فوج کشی کے ساتھ شروع ہوا ہے۔

استعماری حملے، اس بناء پر، سامراجیت کے توسیعی عمل کا حصہ ہوتے ہیں جو ہر جگہ پایا جاتا ہے، مگر فی الحقیقت انہیں مجموعی عمل کا حصہ سمجھا جانا چاہیے۔ پچھلے دو سو برس میں سامراجیت، بالادست ملکوں کی جانب سے استعمال کی جانے والی عالمی طاقت کا نظام رہی ہے، تاکہ یہ ممالک وسائل کو اپنے

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] o

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] o

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

کے لیے کوشاں ہے۔

قوموں اور مختلف سماجی نظاموں کے درمیان سامراجی کشمکش، اس عمل کا حصہ اور آج کی سامراجیت کا کلیدی جزو ہے۔

آج کی سامراجیت کے عناصر

غلبہ و تسلط کے حصول کا جو نظام آج دنیا میں جاری ہے، وہ حسب ذیل عناصر پر، جن کی وضاحت اس تحریر کے اگلے حصے میں کی جائے گی، مشتمل ہے:

- سرمایہ دارانہ تکاثر و ارتکازِ وسائل یا عالمگیریت
- دولت کی بالادستی
- تجارت اور سرمایہ کاری کا سامراجیت کے آلہ کار کے طور پر استعمال
- سامراجیت، سرمایہ داری، ٹیکنالوجی اور سائنس
- فوجی طاقت
- نظریاتی کنٹرول

سامراجی غلبے کی کشمکش: ۱۸۱۵ء سے اب تک

۱۸۱۵ء میں، جب برطانیہ نے نپولین کو واٹرلو میں شکست دی، تو برطانیہ دنیا کی بالادست طاقت بن گیا۔ اس کے بعد کے سو برسوں میں یہ طاقت پوری دنیا پر محیط ہوگئی۔ اپنی برتری کے احساس کے ساتھ، برطانیہ کے حکمراں طبقوں نے مالیات، تجارت اور سرمایہ کاری کے ادارے منظم کیے، اس کے ساتھ ساتھ عسکری قوت کو ترقی دی اور عالمی سطح پر اپنی بالادستی کو مستحکم کرنے کے لیے تدابیر اختیار کیں۔ بیسویں صدی کی ابتدا کے ساتھ برطانیہ نے ٹیکنالوجی کی سرمایہ دارانہ کامیابیوں کو اپنے عالمی غلبے کے لیے ہتھیار بنایا۔ ۱۹۰۰ء کے ساتھ برطانیہ ایک ایسی طاقت بن گیا جسے روکنا محال تھا، اور جو بھی ان معاملات کو سمجھتا تھا، کسی اور طرح نہیں سوچ سکتا تھا۔

بہرصورت، بیس سال بعد، پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) کے خاتمے پر، برطانیہ تھک چکا

تھا۔اس کے سونے کے وسیع ذخائر جنگ کے اخراجات کی ادائیگی کے لیے امریکا منتقل ہو گئے تھے، اور اس کے دسیوں لاکھ جوان موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔۱۹۱۴ء سے پہلے کے عشروں میں جرمنی نئی مقابل قوت تھا، اور اس جنگ کا مقصد، اسے شکست فاش دے کر، برطانیہ کی برتری کو دوبارہ منوانا تھا۔مگر نہ صرف یہ کہ یہ کوشش ناکام ہوئی بلکہ اس جنگ نے روسی انقلاب کے لیے راستہ ہموار کر دیا، اور خواہ انقلاب برپا ہونے کے قریب رہا ہو یا نہ رہا ہو، جنگ نے اس کی خواہش بڑھانے کا کام ضرور انجام دیا۔

اس طرح یکا یک ایک نیا مدمقابل سامنے آ گیا۔نئی سوویت سلطنت نے سرمایہ داری نظام کو مسترد کر دیا اور خود اپنے ہی اثاثوں کو کسی زرتلافی کی ادائیگی کے بغیر قومی تحویل میں لے لیا۔آج تک سرمایہ داروں کے نزدیک سب سے بڑا گناہ نیشنلائزیشن ہے۔نئی بالادست طاقت کے لیے سوویت دوسرا خطرہ تھے۔

یہ نیا خطرہ ۱۹۴۵ء کے خاتمے سے پہلے تک پوری طرح بین الاقوامی اسٹیج پر سامنے نہیں آیا۔۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء تک کی جنگ ...جب بڑی سرمایہ دار طاقتوں، یورپی اقوام اور اس وقت کے جاپانیوں نے دوسری بار ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر دسیوں لاکھ جانیں ضائع کر دیں ...امن معاہدے پر ختم ہوئی جس کا مقصد جرمنی کو سزا دینا اور افلاس میں مبتلا کرنا تھا۔

دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر، امریکا کو نہ صرف یہ کہ دنیا میں اپنی بالاتر حیثیت کا یقین حاصل تھا بلکہ وہ اپنے مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے اپنی طاقت استعمال کرنے کا خواہش مند بھی تھا۔۱۹۴۴ء میں برٹن ووڈز سمجھوتے نے پاؤنڈ اسٹرلنگ کی جگہ امریکی ڈالر کو واحد تجارتی کرنسی کی حیثیت دیتے ہوئے ایک نئے مالیاتی نظام کو جنم دیا۔

۱۹۴۴ء سے ۱۹۸۹ء تک کے دور نے امریکا کو سوویت یونین کو تباہ کرنے کی سرتوڑ کوششوں میں مصروف دیکھا، اس نے ایٹمی جنگ کے سوا اس مقصد کے لیے ہر طریقہ استعمال کیا۔ہر جابر ڈکٹیٹر کی، خواہ وہ کتنا ہی بدعنوان ہو، امریکا کی جانب سے اس وقت تک سرپرستی کی گئی جب تک وہ کمیونسٹ

مخالف مہم کا حامی رہا۔

حتمی یلغار افغانستان میں ہوئی جب پاکستانی حکومت نے یہ طے کیا کہ سرمایہ دار مغرب کے مقابلے میں ملحد سوویتی زیادہ بڑا خطرہ ہیں۔ امریکا کا پیسہ اور ہتھیار، اس کے ساتھ ساتھ دوسرے ملکوں کے وسائل، سوویت یونین کے خلاف جہاد میں تعاون کے لیے، بارش کی طرح پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں پر برسنے لگے۔ یہ کوشش کامیاب رہی اور، ان سطور کے لکھے جانے کے وقت، امریکا ان تمام نقصانات کے ازالے کی کوشش کر رہا ہے جو اس مخصوص کارروائی سے ہوئے ہیں۔ اسلامی پاکستان نے یہ راستہ نظریاتی وجوہ سے منتخب کیا مگر اس کی بڑی بھاری قیمت چکانی پڑی۔

۱۹۸۹ء میں امریکا پوری دنیا کی واحد بالادست طاقت کی حیثیت سے سامنے آیا۔ اور لوگوں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ کیا امریکا مہربانی کا رویہ اپنائے گا؟ اس طرح کے سوالات ان لوگوں کی طرف سے پوچھے گئے جو سامراجیت کو سمجھتے نہیں تھے۔ کسی بھی دَور کی بالادست طاقت اپنا تسلط چاہتی ہے، اپنے مقتدر طبقوں کو زیادہ سے زیادہ دولت مند بنانے کی خواہش مند ہوتی ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ باقی دنیا اس سے خوف زدہ رہے۔ آج کی دنیا میں بھی ایسی کوئی چیز نہیں جسے مہربان سامراجی طاقت کہا جا سکے۔

چین سے درپیش چیلنج اب تک اپنی کمیت کے حوالے سے مبہم ہے۔ اسلام کی طرف سے درپیش چیلنج کی بہت سی شکلیں ہیں: مثلاً بن لادن جس کی موجودگی افغانستان کے ریگزاروں میں فرض کی جاتی ہے، عراق میں امریکا کے استعماری تجربے کو درپیش چیلنج جو فی الوقت ہر روز اپنا اظہار کرتا ہے، وہ لوگ جو انقلابی اسلام کے حق میں دلائل دے رہے ہیں، اور وہ طاقتیں جو مستقبل کے لیے ایسے اسلامی قائدین تیار کر رہی ہیں جو مغرب سے آنے والی ہر چیز کو مسترد کرتے ہیں۔ ایسے بہت سے اشارے ہیں، مگر ابھی کوئی بات واضح نہیں ہے۔

سرمایہ دارانہ تکاثر و ارتکازِ دولت یا عالمگیریت

آیئے ہم سرمایہ داری کے ماتحت استعماریت کا تجزیہ منافع اور دولت بڑھانے کے رجحان کے

جائزے سے کریں جو علاقائی توسیع پسندی کا اصل سبب ہے۔ لگی لپٹی کے بغیر کہا جائے تو سرمایہ داری کی منطق صرف دولت میں اضافہ ہے اور سائنس اور ٹیکنالوجی میں مسلسل انقلاب کی شمولیت کے بعد اس نے پچھلے دو سو سال کے دوران، عام لوگوں کے لیے، ہر نئی نسل کے خوابوں کے برعکس، دولت جمع کرنے کے بہت تھوڑے مواقع باقی رہنے دیے ہیں۔

ذاتی دولت کو بڑھانے کا رجحان اور اس کے ذریعے سیاسی طاقت کا حصول، ایسا اشتہا انگیز عمل ہے جس کی وضاحت مشکل ہے۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں سر چکرا دینے والے دولت کے انباروں کے حصول کے راستے، مٹھی بھر وسائل رکھنے والوں کے لیے بھی کھل گئے۔ بینکوں، آئل کمپنیوں، نئی ڈیجیٹل کمپنیوں اور بنیادی ضروریات جیسے پانی اور خوردنی اشیاء کے کاروبار سے وابستہ کمپنیوں نے ہماری دنیا کو ہلا ڈالا۔ یہ دولت کو مسلسل بڑھانے کی منطق ہی ہے جس نے پچھلے دو سو برسوں میں بالا دست قوموں کو استعماری اور سامراجی دونوں طرح کی توسیع پسندی پر اکسایا۔

ان کمپنیوں نے جب دنیا کے گوشے گوشے میں نفوذ کیا، تو انہیں وجود میں لانے والی ریاستوں کو' اپنی مسلح افواج کے ذریعے انہیں تحفظ فراہم کرنے، سرمایہ کاری کے لیے سازگار حالات مہیا کرنے، اور منڈی کے اندر اور باہر ان کی نقل و حرکت کو آسان بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی، اور نتائج کی ذمہ داری لیے بغیر انہوں نے یہ کام انجام دیا۔ مستحکم مالیات، آزاد تجارت اور سرمایے کی آزادانہ نقل و حرکت، وسیع پیمانے پر تکاثر و ارتکازِ سرمایہ کی لازمی شرائط ہیں۔ یہ بحث کہ کیا یہ طریقے ریاستوں کے لیے خود اپنے عوام کی حالت بہتر بنانے اور اپنے وسائل کو ترقی دینے میں بھی مددگار ہیں، صرف سامراجی منطق کو درست ثابت کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ دولت میں مسلسل اضافے کی پوری منطق درحقیقت بیک وقت عالمی بھی ہے اور سرمایہ دارانہ بھی۔

''تکاثر و ارتکازِ سرمایہ'' کی اصطلاح کی جگہ اکثر نسبتاً کم واضح اصطلاح ''عالمگیریت'' استعمال کی جاتی ہے۔ سامراجی توسیع کے عمل اور دنیا کے وسائل پر تسلط کا اصل مقصد سامراجی ملکوں کی کمپنیوں، جیسے: بینکوں، بیمہ کمپنیوں، صنعت کاروں، اور دوا ساز کمپنیوں وغیرہ کی دولت میں اضافہ

ہے۔اس کا نتیجہ پوری مغربی دنیا میں نسبتاً دولت مند متوسط طبقوں کے نچڑتے چلے جانے کی شکل میں سامنے آرہا ہے۔دنیا کے حکمراں طبقوں کے ہاتھوں میں بیشتر دولت کے جمع ہوتے چلے جانے کی وجہ سے، متوسط طبقے کا حال مسلسل ابتر ہوتا جارہا ہے اور اس کے پاس بچے کھچے ٹکڑوں کے سوا کچھ نہیں رہ گیا ہے۔

تکاثر اور ارتکاز کا جو عمل سامراجی قوموں کے اپنے اندر جاری ہے، اسے دیکھنا اور سمجھنا بہت آسان ہے۔مثال کے طور پر یہاں آپ تین یا چار بڑی کمپنیوں کو غذائی اشیاء فروخت کرتے دیکھیں گے۔تقریباً اسی تعداد میں بک اسٹور چلانے والی کمپنیاں بھی ملیں گی۔پیداوار اور فروخت کے ہر شعبے میں، سرمائے کا ارتکاز اس حد کو پہنچ رہا ہے کہ چھوٹی کمپنیوں کے لیے اس بڑے بلیک ہول میں گم ہوجانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جائے گا۔برطانیہ میں صرف چار کمپنیاں، ۵۵ ملین انسانوں کے استعمال میں آنے والی کل غذائی اشیاء کا ۹۰ فی صد فروخت کرتی ہیں۔

تمام یورپی ملکوں اور شمالی امریکا میں سرمایہ دارانہ تکاثر اور ارتکاز کا عمل بہت نمایاں ہے۔تیسری دنیا کے بہت سے ملکوں میں یہ عمل ابھی اس درجے تک نہیں پہنچا ہے۔یہاں آپ اب بھی چھوٹے تاجروں کو بہت بڑی تعداد میں اکثر وہی اشیاء فروخت کرتے ہوئے پائیں گے لیکن بڑے تنوع کے ساتھ۔

اپنے کاروبار کو بیرونی ملکوں تک وسیع کرنے کے لیے مغربی کمپنیوں پر بڑا دباؤ ہے۔اکثر صورتوں میں ان کے اپنے ملکوں میں کاروبار کے پھیلاؤ کے مواقع آخری حد تک پہنچ چکے ہیں۔اگر انھیں اپنے منافع کی سطح کو برقرار رکھنا ہے تو ان کے لیے کاروبار کو بیرونی ملکوں تک وسعت دینا ضروری ہے۔یہ نکتہ بھی کسی وضاحت کا محتاج نہیں کہ مزید منافع کے لیے نئی منڈیوں کی مسلسل تلاش سرمایہ داری کا خاصہ ہے۔

جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کا خاتمہ اس عمل کی تازہ مثال ہے۔بڑی بڑی اجارہ داریاں، سونے اور ہیرے کے کاروبار اور طاقت، نسلی امتیاز کے نظام کی جانب سے بنائی گئی محصولات کی دیواروں کے پیچھے پروان چڑھائے گئے تھے۔تاہم ان کی پیداوار کے لیے منڈی بہت محدود تھی، اور وسائل کی تقسیم

کے نظام کو تبدیل کرنے اور مقامی لوگوں کو دولت مند بنانے کے سوا ان کمپنیوں کے پاس کاروبار کو فروغ دینے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ دنیا کی جانب سے اس ملک کی پیداوار کے بائیکاٹ کے نتیجے میں جن دیواروں نے ان کا محاصرہ کر رکھا تھا، انہیں توڑنا ان کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ وہ جنوبی افریقہ تک محدود رہنے کے بجائے عالمی سطح کی کمپنیاں بننا چاہتے تھے، اور یہ وہ مقصد تھا جس کے لیے گوروں کی اجارہ دارانہ طاقت ختم کی گئی۔

اپنی قومی سرحدوں سے باہر اپنا کاروبار پھیلانے والی تمام کمپنیاں سوویت دور کو یاد رکھتے ہوئے اس خوف کا شکار رہیں کہ ان کے اثاثے قومیائے جاسکتے ہیں۔ اپنے تحفظ کے لیے انہیں آئی ایم ایف (بین الاقوامی مالیاتی فنڈ) اور عالمی بینک جیسے بڑے مالیاتی اداروں کی جانب دیکھنا ہوتا ہے۔ آئی ایم ایف سے انہیں جو کچھ درکار ہوتا ہے اس میں سے پہلی چیز نئی سرمایہ کاری کے لیے اس ملک کی سرحدوں کو کسی رکاوٹ کے بغیر کھولنا ہے، اس کے بعد کاروبار کو قومیائے جانے سے تحفظ مہیا کرنا، پھر ان کمپنیوں کے منافع کو کسی غیر معمولی محصول کے بغیر اپنے ملکوں کو برآمد کرنے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے کاروبار کو اپنی مرضی کے مطابق ختم کر کے واپس جانے کی آزادی اس فہرست میں شامل ہے۔

جہاں کہیں یہ ادارے اپنے پاؤں جما لیتے ہیں، بین الاقوامی بینک اور آٹو موبائل کمپنیاں زیادہ سے زیادہ ساز و سامان کے حصول اور حرص و لالچ کے جذبوں کو اکساتی ہیں خواہ اس ملک کے مذہب کے حوالے سے ایسا کرنا کتنا ہی حساس معاملہ کیوں نہ ہو۔

آج امریکا اپنے تمام بڑے لین دین کے اداروں کے پوری دنیا میں پھیلاؤ کی جارحانہ طور پر حمایت کر رہا ہے۔ ڈزنی کارپوریشن سے بل گیٹس کے مائیکروسافٹ تک، امریکا قومی حکومتوں کی حفاظتی پیش بندیوں کو ختم کرانے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھانے کو تیار ہے۔

دولت کا عالمگیر اور سرمایہ دارانہ ارتکاز، سامراجی عالمگیریت کی جڑ بنیاد ہے۔ فاضل دولت جہاں بھی ہو، یہ عمل اسے چوس کر مراعات یافتہ افراد کی دولت کو بڑھاتا ہے، جبکہ اس عمل سے باہر رہ جانے والے تمام لوگوں کی غربت میں مسلسل اضافے کا راستہ کھول دیتا ہے۔ اس حقیقت کو عالمی بینک

جیسے ادارے تک تسلیم کر چکے ہیں کہ غربت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔

حقائق صاف نظر آتے ہیں: کثیر القومی کمپنیوں کے ذریعے ترقی، دنیا کی ترقی وخوش حالی کے سوال کا جواب نہیں ہے۔

دولت کی بالادستی

سرمایے میں مسلسل اضافے اور اسے چند ہاتھوں میں مرتکز کرتے چلے جانے کے لیے، جیسا کہ پہلے بات ہو چکی ہے، عالمی سطح پر چند بنیادی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں سے پہلی چیز جس کی وضاحت کی جانی چاہیے، عالمی مالیاتی نظام ہے۔ کوئی بھی موضوع اس قدر ناقص طور پر نہیں سمجھا جاتا جتنا دنیا کا مالیاتی نظام ہے۔ پہلے پاؤنڈ اسٹرلنگ نے ہماری دنیا کے تجارتی نظام پر اپنی بالادستی قائم رکھی، پھر ڈالر نے اس کی جگہ لے لی۔ تجارتی نظام ہی علامتاً بھی اور حقیقتاً بھی دنیا پر کسی طاقت کی بالادستی کے قیام کا ذریعہ ہے۔ یہ کوئی پیچیدہ بات نہیں اور اسے واضح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

۱۸۴۴ء میں انگریزوں نے پہلا عالمی مرکزی بینک اور پہلا بین الاقوامی نظام زر قائم کیا۔ اس نظام میں ایک کاغذی اسٹرلنگ نوٹ، سونے کی متعین مقدار کی جگہ استعمال کیا جا سکتا تھا۔ بینک آف انگلینڈ ہر اس شخص کو جو سونے کی جگہ اس اسٹرلنگ نوٹ کے ذریعے لین دین کرے، سونے کی مقررہ مقدار ادا کرنے کی ضمانت مہیا کرتا تھا۔

مطلب یہ کہ بینک آف انگلینڈ کے لیے ہمیشہ سونے کا اتنا ذخیرہ رکھنا لازمی تھا جو کسی بحران کی صورت میں اسٹرلنگ پر لوگوں کا اعتماد برقرار رکھنے کے لیے کافی ہو۔ گویا مجموعی طور پر، برطانیہ کی تجارت کا توازن مثبت رکھا جانا ضروری تھا۔ یعنی اس کی برآمدات کی آمدنی کو درآمدات کی آمدنی سے زیادہ ہونا چاہیے تھا تاکہ مرکزی بینک میں سونے کی آمد کا سلسلہ برابر جاری رہے۔

برطانیہ کے لیے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سو سال تک عالمی تجارت کا مستقل مرکز بنا رہا جبکہ لندن، حکمراں طبقوں کے لیے زبردست مالی مفادات کے ساتھ، دنیا کے بازار ہائے زر کا محور بن گیا۔

یہ پوری کی پوری عظیم الشان عمارت، ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کی جنگ کے دوران زمین بوس ہو گئی۔ یہ

جنگ اندازوں سے کہیں زیادہ طویل اور شدید ثابت ہوئی۔ اور انگریزوں کو جنگی اخراجات امریکا سے قرض لے کر پورے کرنے پڑے۔ اگرچہ برطانوی حکومت نے ۱۹۲۰ء کے عشرے میں گولڈ اسٹینڈرڈ پر واپس جانے کی بہت سخت کوشش کی مگر برطانیہ اپنی بالادست حیثیت سے محروم ہوگیا۔ جنگ نے اسے سامراجی عزائم کے حوالے سے اتنا کمزور کردیا کہ پہلے کبھی وہ اتنا کمزور نہیں رہا تھا۔ اس کی فوجی اقدام کی صلاحیت بہت کم وقت میں تباہ ہوگئی اور وہ حملہ کرنے کے قابل نہیں رہ گیا۔

امریکا اور عالمی ڈالر

امریکا نے عالمی مالیات پر علانیہ بالادستی ۱۹۴۴ء میں برٹن وُوڈ معاہدے کے ذریعے حاصل کی۔ بہت سادہ طور پر، اب امریکی ڈالر کے بدلے سونے کی ایک مقدار متعین کردی گئی۔ اس نظام کو دنیا کے تمام ملکوں نے مالیاتی کنٹرول کے نظام کے طور پر اختیار کرلیا۔

اس کے بعد ۱۹۷۱ء میں امریکا نے یک طرفہ طور پر گولڈ اسٹینڈرڈ سے باہر آنے کا فیصلہ کیا، اور ڈالر اور دوسرے تمام ملکوں کی کرنسیوں کو عالمی بازار ہائے زر میں آزادانہ گردش کی اجازت دی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سادہ طریقے سے طلب اور رسد ایک کے مقابلے میں دوسری کرنسی کی قدر متعین کریں۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ امریکی ڈالر نے اب بھی اپنی فوقیت قائم رکھی۔

لیکن امریکا کو نیویارک میں اپنے مرکزی بینک میں اب سونا رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اور اس کے معنی یہ تھے کہ، عالمی معاملات میں پہلی بار، رقم کی آمد اور خرچ میں توازن قائم رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ چنانچہ ۱۹۷۱ء سے یہ روایت پڑی کہ جب کسی ملک نے بہت زیادہ امریکی ڈالر کما لیے تو امریکی قومی خزانے کی جانب سے اسے امریکی ٹریژری بانڈ دینے کی پیش کش کی گئی اور اس طرح فاضل ڈالر بانڈز کے بدلے واپس لے لیے گئے۔ جبکہ بیشتر دوسرے ملکوں کو اپنی درآمدات اور برآمدات کی ادائیگیوں میں توازن قائم رکھنا پڑتا تھا، اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو انہیں بڑی ناخوشگوار شرائط پر قرض لینے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

امریکا اب بیرون ملک اپنی برآمداتی آمدنی سے بہت زیادہ خرچ کرنے کے قابل ہوگیا۔ وہ

اب ان ڈالروں کے ذریعے حقیقتاً کسی بھی ملک سے جنگ کے اخراجات برداشت کرنے کے لائق ہوگیا جو اس ملک سمیت دوسرے ملک امریکا کی درآمد کردہ اشیاء کے بدلے ادا کرتے تھے۔ امریکا بیرونی دنیا میں جو بھی فاضل اخراجات کررہا ہے، ہم سب اس کے لیے ادائیگی کررہے ہیں۔

سادہ طور پر اسے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ میں نے ایک ۱۰۰ ڈالر کمائے جبکہ ایک ۱۵۰ اخرچ کیے، اور پھر یہ زائد خرچ کیے گئے ۵۰ ڈلر ایک بونڈ کے ذریعے واپس خرید لیے اور انہیں دوبارہ خرچ کردیا۔ یہ ایک قطعی غیر معمولی نظام ہے اور امریکی شہنشاہیت کے لیے تباہ کن کمزوری ثابت ہوسکتا ہے۔

یہ حیرت کی بات نہیں کہ عالمی مالیاتی نظام آج کی بالادست طاقت کے مفادات کے عین مطابق ہے۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں ہم سب بڑی غیر مستحکم کیفیت کا شکار ہیں جبکہ امریکا وہ واحد ملک ہے جو اپنی برآمدات سے کہیں زیادہ درآمد کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اپنی پیداوار سے بہت زیادہ صرف کرسکتا ہے۔ سطحی قسم کے مبصرین کہتے ہیں کہ یہ کمزور معیشتوں کے لیے بڑے فائدے کی بات ہے کیونکہ اس طرح وہ اپنی اشیاء بہت بڑی مقدار میں امریکا کو برآمد کرسکتے ہیں جبکہ دوسری صورت میں وہ ایسا نہیں کرسکتے تھے۔ ایسی دلیلیں دینے والے سمجھتے ہیں کہ موجودہ عالمی مالیاتی نظام ہمیشہ قائم رہے گا، لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، یہ ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔

مثلاً اگر چین یا مختلف ملکوں کا ایک گروپ طے کرلے کو وہ اپنی کرنسی میں تجارت کریں گے تو وہ اپنے امریکی ٹریژری بونڈ فروخت کردیں گے جس سے امریکی معیشت میں یکا یک بحران پیدا ہوجائے گا اور یوں ممکنہ طور پر پوری عمارت زمین پر آرہے گی۔ ایسی باتیں سوچی جارہی ہیں جیسا کہ میں لکھتا رہا ہوں۔

آزاد تجارت بحیثیت سامراجیت

تجارت اور سمندر پار سرمایہ کاری، عالمی سطح پر سرمایہ دارانہ تکاثر کے بنیادی پتھر ہیں۔ بالادست سامراجی ملک ہمیشہ یہ دلیل دیتے رہے ہیں کہ آزاد تجارت سب کے مفاد میں ہے، اور اپنے اختیار کی حد تک، ان نظریات کو بہت کمزور معیشتوں پر تھوپتے رہے ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ یہ دلائل جھوٹے

ہیں، اور ان کا جھوٹ ہونا معروف ہے۔ اس کے باوجود انتہائی طاقتور ادارے آج ان دلائل کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

آج کی تمام بڑی طاقتوں نے بلا استثنا اپنی صنعتی بنیاد کو محصولات کی دیواروں کے پیچھے مضبوط کیا ہے۔ جاپانیوں نے ۱۸۶۰ء کے عشرے سے اپنے آپ کو تجارت کی دنیا اور سامراجی طاقتوں سے چالیس سال تک کاٹے رکھا، امریکیوں کو اپنے ملک میں صنعتوں کو ترقی دینے کے لیے اٹلانٹک کے پار نقل وحمل کے اخراجات کی وجہ سے سہولت حاصل تھی چنانچہ انہوں نے ۱۹۴۵ء تک آزاد تجارت کے لیے اپنی سرحدیں نہیں کھولیں، جرمنوں نے ۱۸۷۰ء میں اتحاد کے بعد بہت شعوری طور پر اپنے آپ کو محفوظ رکھا۔ دوسرے بڑے ملکوں نے بھی یہی طرز عمل اختیار کیا۔ جرمنوں اور امریکیوں کے اپنے مفکر فریڈرک لسٹ اور دانیال ریمنڈ تھے جو اس وقت مقامی صنعتوں کو تحفظ دینے کے علمبردار تھے۔

بات حقیقتاً بہت سیدھی ہے۔ بڑے ملکوں نے آزاد تجارت اس وقت شروع کی جب ان کی اپنی صنعتیں جدید ترین ٹیکنالوجی استعمال کر رہی ہیں اور کمزور ملک ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

دلائل کھلم کھلا دو رخے ہیں۔ یورپی یونین اور امریکا دونوں کھیت کی پیداوار کی آزاد تجارت میں سرگرم ہونے میں ناکام ہو چکے ہیں جبکہ بہت سی کمزور معیشتوں کو اس راستے پر چلنے کے لیے مجبور کیا جاتا رہا ہے۔ آج انتہائی طاقتور بین الاقوامی تنظیمیں، عالمی بینک، آئی ایم ایف اور ڈبلیو ٹی او، سب آزاد تجارت کے حق میں پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ ان اداروں کے پیچھے طاقت کام کر رہی ہے۔ جب ایک بار کوئی ملک اپنے توازن ادائیگی کے معاملے میں مشکل کا شکار ہوتا ہے تو ان کی قرض دینے کی پالیسیوں کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ یہ کمزور ملک اپنے دروازے آزاد تجارت کے لیے کھول دے۔

ثبوت بہت واضح ہے۔ بحث یوں آگے بڑھائی جاتی ہے: اگر آپ اپنی معیشت کو آزاد تجارت کے لیے کھول دیں گے تو وہ پھلے پھولے گی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انیس سو ساٹھ اور ستر کے عشروں میں، جب ابھی بیشتر ممالک نے تحفظات کی مختلف شکلیں اپنا رکھی تھیں، تو عالمی معیشت نے تین فی صد کی شرح سے ترقی کی، اور دنیا کے تمام علاقوں میں ترقی کی شرح دو سے تین فی صد رہی۔

انیس سواسی اورنوے کی دہائیوں میں، جب آزاد تجارت پر مبنی پالیسیوں نے مقبولیت حاصل کرنا شروع کی، عالمی معیشت کی شرح ترقی مجموعی طور پر دو فی صد تک گر گئی، جبکہ کمزور علاقوں کی ترقی کی رفتار اس سے بھی کم رہی۔ اس دور میں لاطینی امریکا کی شرح ترقی اعشاریہ چھ، براعظم افریقہ کی منفی اعشاریہ سات، اور مشرق وسطیٰ کی منفی اعشاریہ دو رہی۔ آزاد تجارت دنیا کے بہت سے کمزور ملکوں اور علاقوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔

آزاد تجارت کی بحث ابھی آنے والے دنوں میں بہت عرصے تک ہمارے ساتھ رہے گی۔ یہ دلائل عالمی سطح کی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ پچھلے تین عشروں میں باقاعدہ سالانہ معاشی ترقی کے لحاظ سے سب سے زیادہ کامیاب ملک چین رہا ہے۔ اوراسی طرح یہ بھی کوئی باعث حیرت معاملہ نہیں کہ چین کا توازن ادائیگی بھی مثبت رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ اپنی سرحدیں کھولنے کے لیے اس پر دباؤ ڈالا جاسکا اور نہ آج کی بڑی سامراجی طاقتوں کے ضابطوں کی پابندی پر مجبور کیا جاسکا۔

میں کاروبار سے متعلق دانشورانہ پرحقوق جائیداد پر بات کروں گا جو لغوی اعتبار سے جائیداد کی ایک بالکل نئی قسم ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس دستاویز کی ابتدا میں ایک کاپی رائٹ نوٹس ہوتا ہے جو مجھے، یعنی مصنف کو، دستاویز کے مالکانہ حقوق دیتا ہے۔ اس کی بناء پر، دوسروں کو اسے چھاپنے، بیچنے یا کہیں اور لے جانے کے لیے مجھ سے اجازت لینا ہوگی، لکھنے والوں کا یہ حق ایک پیٹنٹ قانون کی حیثیت سے پوری دنیا میں طویل مدت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔

پیٹنٹ قوانین کو اب ڈیجیٹل کاروبار کی دنیا کا احاطہ کرنے کے لیے بہت وسعت دی جاچکی ہے تاکہ ڈیجیٹل صنعت کا تحفظ کیا جاسکے۔ آپ نے جو سافٹ ویئر خریدا ہے، ان قوانین کی رو سے، آپ اسے کہیں لے جاسکتے ہیں نہ کسی کو ادھار دے سکتے ہیں۔ یقینی طور پر آپ اسے فروخت بھی نہیں کرسکتے۔ بلاشبہ کاروبار سے متعلق دانشورانہ حقوق جائیداد (TRIPs) نے بہت سے لوگوں کو غیر قانونی طریقے اختیار کرنے کی راہ دکھائی ہے۔ یہ قوانین ڈیجیٹل دنیا کی پیداوار پر اجارہ داری قائم

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ج) **اسلحہ سازی:** ایسی ہی بڑی چھلانگیں اسلحہ سازی کے میدان میں بھی لگائی گئیں۔ بڑی سامراجی طاقت نے بہت شروع ہی میں اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ اعلیٰ درجے کے ہتھیاروں کے شعبے میں تحقیق اور ترقی عالمی بالادستی کے لیے ناگزیر اور لازمی شرط ہے۔ ری پیٹر گن اور گیٹ لنگ گن نے، جن سے مسلسل گولیوں کی بوچھاڑ کی جاسکتی ہے، ایک اکیلے بندوقچی کو، روایتی علاقائی ہتھیار رکھنے والے لوگوں کے بڑے بڑے ہجوموں کو مار بھگانے اور شکست دینے کے قابل بنادیا۔

گیٹ لنگ گن علامتی طور پر اُن انتہائی ترقی یافتہ جدید ہتھیاروں کے استعمال کی نمائندگی کرتی ہے جو آج عالمی بالادستی میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان میں جوہری دھماکے اور ایٹم بم سمیت آج کے وہ ہتھیار شامل ہیں جن کے ذریعے بم اور دیگر ہتھیار سینکڑوں میل دور سے ہدف پر پھینکے جاسکتے ہیں اور جن میں ٹھیک نشانے پر پہنچنے کے لیے رہنمائی کا نظام موجود ہوتا ہے۔ سامراجی طاقت آج بھی یہ کوشش کر رہی ہے اور فی الحقیقت ہمیشہ کرتی رہی ہے کہ اعلیٰ درجے کے ہتھیاروں کی تیاری میں بھی سب سے آگے رہے اور عالمی منڈی پر بھی اپنی بالادستی قائم رکھے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی اس نظام میں مرکزی اہمیت کے حامل ہیں جسے میں بیان کر رہا ہوں۔ اور بلاشبہ عالمی بالادستی کے موجودہ نظام میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں آگے ہونے کے فوائد بہت زیادہ ہیں۔

اب ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اس نظام میں جب کمزور ممالک اپنے دفاع کے لیے کوئی مہلک ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو کیا ہوتا ہے۔ بالادست قوتیں چاہتی ہیں کہ یہ ہتھیار صرف ان ہی کے پاس رہیں ورنہ وہ جوابی کارروائی کے اندیشے سے بے نیاز ہو کر دوسرے ملکوں کو ڈرا دھمکا نہیں سکیں گی۔ شمالی کوریا، ایران اور عراق کی حالیہ مثالیں صاف اور واضح ہیں، جبکہ ممکنہ طور پر ان کے بعد پاکستان کی باری ہے۔ وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے اسرائیلی ہتھیاروں کو امریکی حکمران نظر انداز کرتے ہیں کیونکہ اسرائیل ان کے نزدیک ان کی شہنشاہیت کی صف اول میں شامل ہے اور تزویری اعتبار سے ان ہی کا حصہ ہے۔

ٹیکنالوجی، ترقی اور سامراجیت کا باہمی تعلق بالکل نمایاں ہے، اور مزید وضاحت کا محتاج نہیں۔ تاہم اب یہ بات واضح ہے کہ اگر کوئی ملک اپنے شہریوں کے سائنس کے ہر شعبے میں مغرب کی جدید ترین تکنیکی معلومات سے اس طرح لیس نہ رکھے جیسے ۱۸۶۰ء میں جاپان نے کیا تھا، تو اس کی جانب سے اپنے دفاع کا کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا۔ ٹیکنالوجی مغرب کو جو بالادستی فراہم کرتی ہے، وہ نہ صرف بجائے خود کمزور ملکوں کے لیے مزاحمت اور دفاع کی ضروری شرط ہے بلکہ بلاشبہ اس مقصد کے لیے ناگزیر ہے۔

فوجی طاقت اور سامراجیت

سائنس اور ٹیکنالوجی پر اب تک کی گئی گفتگو میں فوجی طاقت سے اس کے تعلق کا بھی کچھ ذکر ہوا ہے۔ تاہم پچھلی دو صدیوں کے دوران، زمین، سمندر اور گزشتہ ۷۵ برسوں میں فضا سمیت ہر میدان میں فوجی طاقت ہی بالادستی کا بنیادی سبب رہی ہے۔ آج ہم اس میں خلاء کا اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔

اس سب میں انتہائی جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ فوجی ساز و سامان کی پیداوار کے ذرائع اور اس کے لیے درکار ضروری مالی وسائل کو بھی شامل کیا جانا چاہیے۔ مغرب کی بالادست قوموں کی فائر پاور کے سامنے دو تہائی دنیا جھک جانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ جارحیت کا نشانہ بنائے جانے والوں کے دلوں میں اتنی زیادہ دہشت تھی کہ ۱۸۸۰ء کی دہائی کے استعماری حملے نسبتاً بہت کم متنازع رہے۔ میں یہ بات پوری احتیاط کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ تاہم سو سال بعد اس خطے کے لوگ جسے تیسری دنیا کا نام دیا جاتا ہے، مغرب کے استعماری حربوں کے بارے میں بہت کچھ جان چکے تھے، اور مغرب کی سامراجی قوتوں کی جارحیت کے خلاف مزاحمت کے پیچیدہ طریقے بھی کچھ نہ کچھ سیکھ چکے تھے۔

فوجی مزاحمت

مغرب کی فوجی بالادستی کے خلاف اختیار کیے جانے والے جوابی طریقے پچھلے ساٹھ سال سے سیاسی منظر نامے کا حصہ ہیں۔ ماؤزے تنگ کی تحریک کی کامیاب گوریلا حکمت عملی کی تقلید، دنیا کے دوسرے بہت سے علاقوں میں کی گئی۔ نیپال کے لوگوں نے گوریلا حکمت عملی کے ذریعے اپنی حکومت کو

بزورقوت ختم کر دیا۔

امریکا اور برطانیہ کی جانب سے ان تدابیر کو ناکام بنانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ بڑی طاقتوں کی فوجوں سے تصادم کے تقریباً ہر معاملے سے تشدد اور دہشت گردی بڑے پیمانے پر وابستہ رہی ہے۔ مغربی فوجی طاقتوں کے لیے گوریلا حربوں کا توڑ ایک فن کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ برطانیہ نے کینیا میں ماؤماؤ تحریک کو ناگفتہ بہ ظلم و جبر سے کام لے کر ختم کیا۔ امریکی فضائیہ نے ویت نام اور کمبوڈیا کے لوگوں پر بموں کی بارش برسائی، اور وسطی امریکہ میں لاکھوں افراد لڑائی میں مارے گئے۔ امریکی فوج نے مزاحمت کو ناکام بنانے کے لیے ناقابل تصور دہشت گردی پر مبنی جوابی تدابیر کے لیے مقامی فورسز کو ہتھیار، تربیت اور افرادی قوت فراہم کی۔

تاہم فوجی برتری کا انحصار محض فائر پاور اور انسداد دہشت گردی کے طریقوں پر نہیں ہے، فوجی سراغ رسانی (ملٹری انٹیلیجنس) اس کے لیے انتہائی اہم ثابت ہوئی ہے۔ کم ہی لوگ Echelon کے بارے میں جانتے ہیں۔ یہ ڈیجیٹل ٹیلی فون کال سننے اور ای میل اور فیکس پیغامات میں مداخلت کرنے کا آلہ ہے۔ اس میں سٹیلائٹ ٹیکنالوجی اور زمین پر موجود کارندوں سے کام لیا جاتا ہے۔ الیکٹرانک جاسوسی کے لیے یہ سب سے کامیاب چیز ہے۔

ایکی لون کی ابتدا دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ میں ہوئی جس کا مقصد جرمنی کی آبدوزوں کا پتہ لگانا تھا۔ اس کے بعد سے جب برطانیہ نے امریکیوں کو اپنی تکنیکی معلومات میں شریک کیا تو دونوں ملکوں نے بڑی رازداری کے ساتھ اس تکنیک کو ترقی دینے کے لیے بھاری رقوم خرچ کیں۔ یہ دونوں ممالک پورے کرہ ارض پر ہر شخص کی بات چیت سن سکتے تھے۔ اور اب جبکہ امریکی اڈے پوری دنیا کا محاصرہ کر رہے ہیں تو پہلی چیز جس کا وہ اہتمام کرتے ہیں وہ لوگوں کی بات چیت سننے کے آلات ہیں جو امریکا اور برطانیہ میں ان کے مرکزی دفاتر سے منسلک ہوتے ہیں۔

امریکی اڈے آج وسطی ایشیا سے مغربی چین تک، اور بحیرۂ کیسپین سے جنوبی یورپ تک، پوری دنیا کا گھیراؤ کیے ہوئے ہیں۔ یہ ساری منصوبہ بندی ایکی لون کے ذریعے کی گئی مقامی جاسوسی اور

تیز رفتار طیاروں کی مدد سے قریبی علاقوں میں فوج اتارنے کے لیے کی گئی ہے۔

امریکا کی فوجی برتری سنگین طور پر متاثر ہو سکتی تھی اگر ان بین الاقوامی معاہدوں کے ذریعے، جن میں سے بہت سے سرد جنگ کے زمانے میں کیے گئے تھے، اس کی آزادیٔ عمل کو محدود کیا جاتا۔ اب جبکہ سوویت یونین کی شکل میں کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جسے قابو میں رکھنے کی ضرورت ہو، ذیل میں دیے گئے بین الاقوامی معاہدے خود ہی بڑی حد تک عمل میں آنے کا جواز کھو چکے ہیں۔ معاہدے یہ ہیں:

- ایٹمی دھماکوں پر پابندی کا جامع معاہدہ
- بین الاقوامی عدالت انصاف
- ۱۹۷۲ء کا انسداد بین البراعظمی میزائل معاہدہ
- ہتھیاروں کی منتقلی پر کنٹرول کے لیے اقوام متحدہ کی تجاویز
- خلائی ہتھیاروں کی تیاری پر کنٹرول
- کیوٹو پروٹوکول
- حیاتیاتی اور زہریلے ہتھیاروں پر پابندی کا سمجھوتہ

امریکی حکومت نے محسوس کیا کہ ان معاہدوں اور سمجھوتوں کے ذریعے اسے محدود کیا جا سکتا ہے لہٰذا وہ اپنے سامراجی دور کے اوائل میں ان پر بات چیت کی زحمت گوارا کرتی رہی۔ پھر عالمی صورت حال بدل گئی۔ سن ۲۰۰۰ء تک امریکی فوجی اعتبار سے اتنے طاقتور ہو گئے کہ ان سے چھوٹا کوئی بھی ملک ان کی خواہشات کی تعمیل سے انکار کرنے کے قابل نہیں رہ گیا۔

سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ ہتھیاروں کی یہ ساری ریل پیل اور یہ فوجی تیاریاں کس مقصد کے لیے ہیں، امریکا اپنے آپ کو عالمی نظام کے واحد ٹھیکیدار اور کائنات کے غیر متنازع مالک کی حیثیت سے کیوں پیش کرتا ہے؟

سلطنت اور نظریہ

تمام سلطنتوں کو ایک نظریے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں ایک سامراجی نظریے کی ضرورت سب سے پہلے خود اپنے شہریوں کو اپنے ناجائز وجود کے جواز پر مطمئن کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ ایک طرف سامراجی ریاستوں کے حکمراں طبقات دولت کے وسیع ذخائر رکھتے ہیں اور دوسری طرف جو لوگ ان سلطنتوں کو چلاتے ہیں، وہ اپنے نظریے کے غلط ہونے سے بھی واقف ہوتے ہیں اور انہیں اپنے عوام کے سامنے اپنے آپ کو جائز، برحق اور اخلاقی طور پر درست ثابت کرنے کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ جن لوگوں کو کمتر مخلوق کی حیثیت سے اپنا محکوم بناتے ہیں، انہیں مشتبہ اخلاقی کردار کا حامل بلکہ شاید متشدد اور ناقابل اعتبار ظاہر کرنا بھی ان کی ضرورت ہوتا ہے۔

اگر ہم پہلے مختصراً برطانوی نظریے کا تجزیہ کریں جسے ان کے پورے دور شہنشاہیت میں استعمال کیا گیا تو ہم اوپر کہی گئی باتوں کی سچائی کو دیکھ سکتے ہیں۔

برطانوی سلطنت جس معجون مرکب کی بنیاد پر چلائی گئی اس کے اجزء میں بادشاہ کے گرد قائم انگریزی قومیت، نسلی فوقیت، تہذیب وتمدن اور اس کی بہت سی مشنری تنظیموں کے رویے سے جھلکنے والی مذہبی برتری شامل تھی۔ یہ تمام اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ خوبصورتی سے جوڑ کر رکھے گئے تھے۔

نسلی برتری کی یہ شاندار عمارت ۱۹۴۵ء میں زمیں بوس ہوگئی۔ ان نظریات کے منطقی نتائج جنگ کے دوران جرمنی میں یہودیوں کے قتل عام (ہولوکاسٹ) میں ظاہر ہوئے۔ برطانیہ اور جرمنی کے نسلی برتری کے نظریات میں کبھی کوئی فرق نہیں رہا تھا، جبکہ جنگ نے برطانوی اعلیٰ طبقوں کے نسلی برتری کے تصور کو خاک میں ملا دیا۔

آج کوئی بھی پرانے نوآبادیاتی نظریے پر یقین نہیں رکھتا۔ اسے کاٹھ کباڑ کی طرح مسترد کیا جا چکا ہے، لیکن اُس وقت یہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ ایک ثابت شدہ ''حقیقت'' باور کیا جاتا تھا۔

امریکا کے سامراجی نظریے نے برطانوی تصورات کی جگہ لے لی ہے۔ ان کے درمیان بہت سی مماثلتیں بھی ہیں اور کچھ نمایاں فرق بھی۔ بنیادی بات یہ ہے کہ امریکی اپنے ملک کے اندر اور باہر

اس نظریے پر یقین رکھتے ہیں۔

برطانیہ ہی کی طرح امریکی نظریہ بھی ایک معجون مرکب ہے۔ اس میں جھنڈے، اخلاقیات اور تہذیب کی جگہ ''آزادی''، ''جمہوریت'' اور ابھی حال ہی میں ''دہشت گردی'' نے لے لی ہے۔ امریکی سفارت کار بیرونی ملکوں میں کہتے پھرتے ہیں کہ پشتون جمہوریت کو اپنا رہے ہیں، لیکن اگر وہ اس کے مفہوم کو سمجھتے ہیں تو ان کا اسے تسلیم کرنا ہر ایک کے لیے حیرت انگیز ہوگا۔

آیئے ہم اس تصور کی خامیاں واضح کرنے کے لیے اس کا مختصراً تجزیہ کریں۔ میری رائے میں، پختہ سرمایہ دارانہ معیشتوں میں، پورے نظام کے جواز پر لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے جمہوریت کو استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی سیاسی پارٹی معاشرے میں کوئی حقیقی تبدیلی لانا چاہے، مثلاً وہ سوشلسٹ یا اسلامی ریاست کے قیام کی کوشش کرے، تو اسے قطعی طور پر معلوم ہونا چاہیے کہ اسے امریکا، یا واشنگٹن سے معاہدے کے تحت، برطانیہ میں تربیت یافتہ مقامی فوج کے ذریعے اکھاڑ پھینکا جائے گا۔ Allende کے ماتحت چلی میں حکومت کی ایسی تبدیلی کی کوشش اس حوالے سے آخری مثال ہے۔ جب الجزائر میں اسلامی جماعتوں کی کامیابی کے امکانات نمایاں نظر آئے تو وہاں مسلح افواج کے ذریعے انتخابات منسوخ کرا دیے گئے۔

جمہوریت، اس لحاظ سے، محض نظام چلانے والے افراد کی تبدیلی کا نام ہے۔ اب یہ بھی دیکھ لیجیے کہ امریکا میں برسراقتدار آنے والے صدر کو ووٹ دینے والے شہریوں کا تناسب کیا ہوتا ہے۔

- پچیس فی صد لوگوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔
- باقی ۷۵ فی صد لوگوں میں سے صرف ۵۰ فی صد عملاً ووٹ دیتے ہیں۔
- اب اگر دو امیدوار ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بالغ آبادی میں سے صرف ۱۸٫۷۵ فیصد لوگ نئے صدر کو ووٹ دیتے ہیں۔ جبکہ تین امیدوار ہونے کی صورت میں یہ شرح ۱۴ فی صد تک گر جاتی ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں ہر شخص خود اپنے نتائج اخذ کر سکتا ہے۔ یہ ہے وہ نظام جس کے بارے میں امریکا چاہتا ہے کہ دنیا کی ہر قوم اسے اپنا لے۔ اور ہر مہذب سوسائٹی برطانوی نظام کے اس

امریکی ورژن پر استوار ہو۔ یہ ہے وہ جواز جو عراق پر حملے کے لیے امریکی ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ کیا وہ صاف جھوٹ نہیں بول رہے ہیں اور کیا وہ خود بھی اپنے نظریے پر یقین رکھتے ہیں؟

امریکی سامراجیت کا یہ معجون مرکب، خود اپنا ایک خط امتیاز رکھتا ہے۔ ۱۶۲۰ء کے عشرے میں نیو انگلینڈ پہنچنے والے بانی اکابر نے بائبل کے عہد نامہ قدیم اور یہودی روایات سے ایک طاقتور نظام تصورات اخذ کیا۔ وہ یہاں.. خدا کے نئے اسرائیل.. پہنچے، اور کہا: یہ وہ سرزمین ہے جس کا وعدہ کیا گیا تھا، اور یہ حقیقت کہ بحراوقیانوس کو پار کر کے وہ یہاں تک پہنچنے میں کامیاب رہے، اس کا ثبوت ہے کو وہ خدا کے منتخب بندے ہیں۔

امریکا سے باہر کے لوگوں کے لیے یہ سب سمجھنا مشکل ہے، لیکن یہ تصورات برقرار ہیں، اور اب یہاں دسیوں لاکھ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ وہ 'دنیا کے لیے ایک مشن' کے حامل ہیں، اور وہ راست بازی جس کا صدور امریکی صدر کی ذات سے ہوتا ہے، ان کے ہم وطنوں کے لیے ایک طاقتور بازگشت کی حامل ہے۔

تمام سامراجی نظریوں کی بنیاد ان کی قومی دیومالاؤں میں ہوتی ہے، لیکن ان کا اطلاق دوسری قوموں پر کیا جائے تو یہ دھاندلی ہے۔

آج کے دور میں تعلقات عامہ کی کمپنیاں دانستہ ایسے تصورات کو پروان چڑھاتی ہیں جن کا مقصد رائے عامہ کے لیے سامراجی توسیع اور تسلط کو قابل قبول بنانا ہوتا ہے۔ نئے نئے تصورات ابھرتے اور غائب ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

- حکومت کی تبدیلی = فوجی کارروائی
- پیشگی دفاع = فوجی کارروائی
- برائی کا محور = وہ ممالک جنھیں قابو میں لانا مطلوب ہو
- شاک اینڈ آوو = دہشت گردی کے امریکی طریقے
- دہشت گردی سے جنگ = لامتناہی جنگ، جہاں ہم چاہیں

موجودہ امریکی نظریاتی تصویر کا آخری جزو وہ طریقہ ہے جس کے مطابق یہ تمام تصورات پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے پیش کیے جاتے ہیں۔ان ذرائع ابلاغ کی ملکیت اور کنٹرول اکثر صورتوں میں چند ہاتھوں میں مرتکز ہے، اور یہ سب نجی ملکیت میں ہے۔یہ ذرائع برسراقتدار حکومتوں کی خوشامدانہ حمایت کرتے ہیں۔ان کی جانب سے حکومت کی پالیسیوں پر کیے جانے والے تبصرے ہر قسم کی تنقید سے مبرا ہوتے ہیں۔امریکا کی کسی بھی حکومت کو ان ذرائع کی جانب سے یہ ضمانت حاصل ہوتی ہے کہ اس کے توسیع پسندانہ سامراجی منصوبے کیسے بھی ہوں، یہ ذرائع ان کے لیے کیے جانے والے فیصلوں کی حرف بحرف تائید کریں گے۔

امریکہ آزاد لوگوں کی سرزمین ہوسکتا ہے مگر اخبارات اور ٹی وی چینلوں کی آزادیٔ اظہار یہاں مدتوں پہلے ختم کی جاچکی ہے۔

خلاصہ مباحث اور بنیادی نتائج

میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ عالمی سرمایہ داری، دورِ حاضر کی سامراجیت کا مرکزی جزو ہے۔جس عالمی سرمایہ داری کا ہم آج تجربہ کررہے ہیں، ایسی متعدد اہم خصوصیات کی حامل ہے، جو خاص طور پر امریکا کی سامراجی مہم جوئیوں کا تعلق پوری دنیا کے لوگوں سے جوڑ دیتی ہے۔

الف) عالمی سرمایہ، اطلاعات کے ڈیجیٹل نظام کی وجہ سے متحرک ہے۔

ب) اس کے تحت پیداوار کا یکساں نظام قائم ہے۔کارسازی کی صنعت میں شاید یہ سب سے نمایاں ہے۔

ج) پوری دنیا میں ملک اور علاقے ایک دوسرے سے جڑ چکے ہیں یا جڑتے چلے جارہے ہیں، جیسا کہ آزاد تجارت کے مختلف خطوں میں نظر آتا ہے، ان میں سے دو یورپی یونین اور نارتھ امریکا فری ٹریڈ ایریا ہیں۔

د) ایک واحد عالمی حکمراں طبقہ بھی وجود میں آچکا ہے اور سرگرم عمل ہے۔طبقاتی طاقتوں نے سرمایے کی شکلوں اور خصوصیات کو بے رحمی سے بدل دیا ہے۔آج یہ طبقہ باہمی مشاورت سے ہمارے

دور کے بڑے معاملات کے فیصلے کرتا ہے، جس کے لیے نیم سرکاری اور نجی فورم استعمال کیے جاتے ہیں۔ جی ایٹ، ٹیووس، بنڈر برگ، وہ نام ہیں جہاں سرمایے اور سیاست کے میدانوں میں قیادت کرنے والے ایک دوسرے سے ملتے اور سامراجی حکمت عملی طے کرتے ہیں۔

ھ) نئی ڈیجیٹل ٹیکنالوجی، قومی معیشتوں کے تحفظ کی تدابیر کو بے اثر بنا رہی ہے اور پیداواری عمل کو انقلابی طور پر بدل ڈالنے کے ذرائع مہیا کر رہی ہے۔

ہماری سامراجی دنیا، ان سب سے مختلف ہے جو پہلے گزر چکی ہیں۔ یہ سیکولر نظام کی حامل ہے۔ اخلاقیات کو بھی بازار کی جنس بنا دیا گیا ہے۔ مذہب محض انسان اور فطرت کے باہمی تعلق کا نام ہے، گزشتہ ادوار میں اسے دوسری دنیا یعنی عالم آخرت کی اصطلاحات میں بیان کیا جاتا تھا، لیکن اب یہ ایک قابل خرید وفروخت شئے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ فن اور بیماری بھی بازار کی جنس بن چکے ہیں اور کاروبار سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ غذا اور پانی جیسی بنیادی ضروریات، حتیٰ کہ دانشورانہ پراپرٹی بھی، اب منڈی کا مال ہے۔ اگر آپ کے پاس ادائیگی کے لیے رقم نہیں ہے، تو آپ ان میں سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

اس سب کا نتیجہ پیداوار اور صرف کا ایک ایسا نہایت متحرک مگر انتہائی ظالمانہ استحصالی نظام ہے جس کا تجربہ دنیا کو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ بالا دست ملکوں کی سامراجی دسترس تمام حدود وقیود سے بالاتر ہے۔